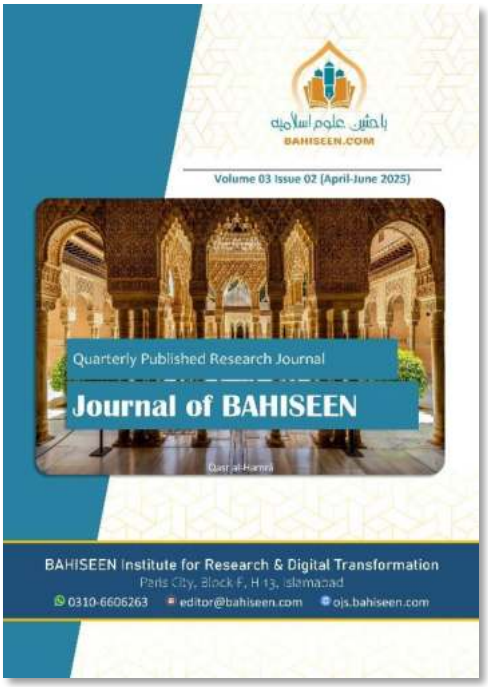


**Title**
Journal of BAHISEEN
**Issue**
Volume 03, Issue 03,
July -September 2025
**ISSN**
ISSN (Online): 2959-4758
ISSN (Print): 2959-474X
**Frequency**
Quarterly
**Copyright** ©
Year: 2025
Type: CC-BY-NC
**Availability**
Open Access
**Website**
ojs.bahiseen.com
**Email**
editor@bahiseen.com
**Contact**
+923106606263
**Publisher**
BAHISEEN Institute for
Research & Digital
Transformation, Islamabad

# اسلاموفوبیاکی تحریک: عوام میں اثرپذیری کے اسباب وطریقہ کار کا تجزیاتی مطالعہ

**Syeda Shumaila Rubab Rizvi**
PhD Scholar, Department of Quran and Sunnah,
University of Karachi
Email: shumaila.rubab@salu.edu.pk

## Abstract

This research paper, titled "The Islamophobia Movement: An Analytical Study of its Causes and Mechanisms of Public Influence," delves into the complex and pervasive issue of Islamophobia. It posits that Islamophobia is not merely a manifestation of fear or hatred but a deliberate and organized movement that utilizes psychological, linguistic, and media-related tactics to manipulate public perception of Islam and Muslims. The study aims to provide a comprehensive analysis of the core factors that enable this movement to gain traction within public discourse.

The research investigates several key hypotheses. First, it explores the concept of "mind-shaping," analyzing how the Islamophobia movement constructs a negative psychological framework within public consciousness. It examines how this framework is built using a hidden language of hate within public narratives. Second, the paper scrutinizes the deliberate semantic distortion of key Islamic terms like "**Jihad**," "**Shari'ah**," and "**Khilafah**," which are stripped of their original meanings and presented as symbols of terror and extremism. The study also analyzes the role of modern media in the deliberate destruction of Islamic identity, highlighting how new platforms are exploited to disseminate misinformation and stereotypes.

Furthermore, this paper addresses the phenomenon of **public silence and apathetic consciousness**, arguing that this inaction inadvertently provides an enabling environment for the Islamophobia movement. Simultaneously, it brings to light the crucial role of resistance from non-Muslim intellectuals who have spoken out against Islamophobia. This resistance serves as a powerful "light of conscience" against the prevailing public narrative. By employing sociological, psychological, and communication theories, this study provides a nuanced understanding of the Islamophobia movement's multifaceted nature and its profound impact on global society and interfaith harmony.

**Keywords:** Islamophobia, Public Influence, Psychological Construction, Media, Semantic Distortion, Resistance, Apathy

عصر حاضر میں اسلاموفوبیا ایک سنگین اور عالمگیر مسئلہ بن چکا ہے، جو نہ صرف مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کو متاثر کر رہا ہے بلکہ بین المذاہب ہم آہنگی اور عالمی امن کے لیے بھی خطرہ ہے۔ اسلاموفوبیا محض مسلمانوں سے نفرت یا خوف کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک منظم اور شعوری تحریک ہے، جو مختلف ذرائع سے عوامی ذہنوں میں اسلامی اقدار، تعلیمات اور شناخت کے بارے میں منفی تاثرات پیدا کرتی ہے۔ یہ تحریک عوامی ذہن سازی کے لیے خاص طور پر نفسیاتی، لسانی اور ابلاغی حربے استعمال کرتی ہے۔ اس مقالے کا مقصد اسلاموفوبیا کی اس منظم تحریک کا تجزیاتی مطالعہ کرنا اور ان اسباب اور طریقہ کار کا جائزہ لینا ہے جو اسے عوام میں اثر پذیر بناتے ہیں۔

یہ تحقیق اس سوال کا جواب تلاش کرے گی کہ اسلاموفوبیا کی تحریک کس طرح ذہن سازی کے محاذ پر کام کرتی ہے، عوامی بیانیے میں نفرت کی چھپی ہوئی زبان کیسے استعمال ہوتی ہے، اور کس طرح اسلامی اصطلاحات جیسے "جہاد"، "شریعت" اور "خلافت" کی معنوی تحریف کر کے انہیں دہشت اور خوف کی علامت بنایا جاتا ہے۔ مزید برآں، یہ مطالعہ اس بات پر بھی روشنی ڈالے گا کہ عوامی خاموشی اور شعوری بے حسی کس طرح اس تحریک کی غیر مرئی معاونت کرتی ہے، اور نئے ذرائع ابلاغ کس طرح اسلامی شناخت کو مسخ کرنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، یہ مقالہ ان غیر مسلم دانشوروں کی مزاحمت کو بھی نمایاں کرے گا جنہوں نے اسلاموفوبیا کے خلاف آواز اٹھائی ہے، جو کہ عوامی بیانیے کے خلاف ضمیر کی روشنی کا ایک ثبوت ہے۔ اس مقالے میں مختلف سماجی، نفسیاتی اور ابلاغی نظریات کی روشنی میں ان تمام پہلوؤں کا گہرا جائزہ لیا جائے گا۔

## ذہن سازی کا محاذ: عوامی شعور میں اسلاموفوبیا کی نفسیاتی تعمیر

اسلاموفوبیا کی وہ صورت جو سب سے زیادہ خطرناک اور پائیدار ہے، وہ کسی ادارے یا قانون کے ذریعے نہیں، بلکہ عوامی ذہن سازی کے غیر محسوس، مستقل اور تہہ در تہہ عمل کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ عوامی رائے، جو جمہوری معاشروں میں سیاست، میڈیا، تعلیم، اور معاشرتی اخلاقیات کی بنیاد سمجھی جاتی ہے، جب کسی خاص مذہب کے خلاف خوف، شکوک، یا نفرت پر مبنی ہو جائے، تو وہ محض تعصب نہیں رہتی بلکہ اجتماعی ذہنی ساخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی ساخت اسلاموفوبیا کی اصل فکری طاقت ہے جو ریاست سے پہلے معاشرے کو اسلام کے خلاف حساس، ناپسندیدہ، یا حتیٰ کہ حملہ آور بنا دیتی ہے۔ اسلاموفوبیا کے اس مظہر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "فعل" نہیں، "خیال" متشدد ہوتا ہے؛ "ردعمل" نہیں، "تصور" پر حملہ ہوتا ہے؛ اور یہی وہ سطح ہے جس پر مسلمان صرف قانونی یا سیاسی نہیں، بلکہ وجودی و تہذیبی اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ ذہن سازی ایک دن میں نہیں ہوتی بلکہ ایک مربوط ثقافتی، لسانی، اور بصری منصوبے کے تحت پروان چڑھتی ہے۔ اشتہارات، فلمیں، ڈرامے، خبروں کی سرخیاں، مزاحیہ خاکے، فکشن، ناول، سوشل میڈیا میمز، اور یہاں تک کہ روزمرہ محاورات میں اسلام اور مسلمان شخصیت کو مستقل منفی تاثر میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، امریکی ٹیلی وژن پر 2001 سے 2016 کے درمیان نشر ہونے والے 328 مرکزی ڈراموں میں مسلمان کرداروں کو 81٪ مواقع پر دہشت گرد، یا مذہبی شدت پسند کے طور پر دکھایا گیا۔[1]

یہ اعداد و شمار صرف "تفریح" کے اعداد نہیں بلکہ یہ ایک پوری تہذیبی حکمتِ عملی کے اشارے ہیں۔ جب عوامی ذہن کو اسلام کے ساتھ صرف "خطرہ"، "شدت"، "مذہبی جنون"، اور "جمود" جیسے الفاظ جوڑنے کی تربیت دی جائے، تو وہ غیر ارادی طور پر ہر داڑھی والے مرد، ہر حجاب والی خاتون، ہر عربی عبارت، اور ہر مسجد نما عمارت کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس ذہن سازی میں میڈیا کا کردار محوری ہے۔ یورپ کی پانچ بڑی نیوز ایجنسیوں کے 2018 تا 2021 تک کے ہیڈلائن تجزیے سے معلوم ہوا کہ "Islam" سے متعلق خبروں میں 93٪ مواقع پر خطرہ، جرم یا انتہا پسندی سے متعلق بیانیہ استعمال ہوا۔[2]

یہ صرف ابلاغ کا مسئلہ نہیں بلکہ شعور کی ترتیب کا معاملہ ہے۔ جب کوئی مغربی شہری قرآن یا محمد (ﷺ) کا نام سن کر پہلا خیال "بم" یا "بارود" سے جوڑتا ہے، تو اس کے پیچھے کوئی ایک خبر یا بیان نہیں بلکہ برسوں کی ذہن سازی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی اسلاموفوبیا سے پہلے عوامی اسلاموفوبیا وجود میں آتی ہے اور پھر سیاست، قانون، اور پالیسی اسی ذہن کو خوش کرنے کے لیے قانون سازی کرتی ہے۔ ریاست صرف اس کی "ریسورس" فراہم کرتی ہے جو پہلے ہی عوامی ذہن میں مقبول ہو چکی ہو۔

سوشیالوجی کے معروف نظریہ دان Stuart Hall نے اسی مظہر کو "Encoding/Decoding Theory" میں یوں بیان کیا:

"Mass media encodes dominant ideologies into everyday content, which are then decoded by audiences according to cultural predispositions[3]".

"میڈیا عوامی مواد میں غالب نظریات کو ضم کر دیتا ہے، اور پھر ناظرین اپنے ثقافتی رجحانات کے مطابق اسے قبول کرتے ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلاموفوبیا عوامی رائے میں اس لیے سرایت کرتا ہے کہ اسے مستقل، خاموش اور مربوط انداز میں ثقافتی معمول بنا دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر حسن فراز اپنی کتاب اسلام کا مغربی شعور میں استعماری زوال میں لکھتے ہیں:

"جب کسی مذہب کو تشدد، قدامت، اور خطرے کا استعارہ بنا دیا جائے، تو عوامی شعور میں وہ مذہب اب عقیدہ نہیں رہتا وہ ایک ثقافتی ہدف بن جاتا ہے، جس پر طعنہ، مزاح اور فکری اجنبیت کا غلبہ ہوتا ہے۔"[4]

یہ نکتہ اسلاموفوبیا کی فکری گہرائی کو واضح کرتا ہے۔ مغرب میں عوامی شعور اسلام کو ایک استعارے، stereotype یا علامت کے طور پر دیکھتا ہے، نہ کہ ایک زندہ مذہب، فکر، یا تہذیبی تجربے کے طور پر۔ اور یہی وہ سلبی عمل ہے جسے نہ عدلیہ روکتی ہے، نہ پارلیمان کیونکہ وہ محض فکری روایت کے دھارے میں شامل ہو جاتا ہے۔

## رائے عامہ کے اعداد میں نفرت کی چھپی ہوئی زبان

مغربی معاشروں میں اسلاموفوبیا کو عوامی سطح پر جانچنے اور ناپنے کے لیے جو سروے رپورٹس، رائے عامہ کے پولز اور شماریاتی جائزے سامنے آتے ہیں، وہ بظاہر معروضی، غیر جانب دار اور تحقیقی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب ان کا طریقۂ کار، سوالات کی ترتیب، جواب دہندگان کی نفسیات، اور میڈیا کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے، تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ سروے درحقیقت عوامی تعصبات کی جائزہ نگاری (legitimization) کا ایک مہذب ذریعہ بن چکے ہیں۔ سب سے نمایاں مثال Pew Research Center کے وہ سلسلہ وار پولز ہیں جو 2001 سے ہر دو یا تین سال بعد امریکہ، یورپ، اور آسٹریلیا کے شہریوں سے مسلمانوں اور اسلام سے متعلق سوالات کرتے آ رہے ہیں۔ 2021 کے ایک پول کے مطابق:

"69%of French citizens and 59% of Germans believe that Islam is incompatible with their national culture[5]".

"فرانس کے 69 فیصد اور جرمنی کے 59 فیصد شہریوں کا ماننا ہے کہ اسلام ان کی قومی ثقافت سے ہم آہنگ نہیں۔"

یہ بیان صرف ایک رائے نہیں یہ ایک تہذیبی مقدمہ ہے، جس میں اسلام کو ایک "خارجی، اجنبی اور غیر منسلک ثقافت" کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ عوامی شعور میں یہ تصور اس قدر گہرا ہے کہ اسے بدلنے کے بجائے سروے ادارے اسے رپورٹ کرتے ہیں، گویا یہ محض رجحان ہے، حالانکہ یہ رجحان نہیں، بلکہ متعین فکری مہم کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح YouGov UK کے 2022 کے سروے میں پوچھا گیا:

"Do you believe Muslims in Britain have adequately integrated"?

57٪ نے جواب دیا "No"۔

یہ سوال بذات خود "انضمام" کو اکثریتی شناخت کے معیار پر پرکھنے کی ایک کوشش ہے، جس میں "انضمام" کی تعریف مغربی سکیولر ثقافت سے ہم آہنگی کو قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنی ثقافت، لباس، مذہبی عادات، یا عبادات کو برقرار رکھے تو وہ "مکمل انضمام" کے دائرے سے باہر تصور ہوتا ہے، اور یوں اس کی وفاداری، قبولیت اور شرکت پر شک ہونے لگتا ہے۔ یہی ساختیاتی تعصب عوامی پولز کی زبان، ترتیب، اور مقاصد میں سرایت کر چکا ہے۔ جب سوال ہی اس اسلوب میں پوچھا جائے:

"Do you think Islam poses a threat to Western values"?

تو جواب خواہ کچھ بھی ہو، سوال کا اسلوب پہلے ہی اسلام کو خطرہ کے ساتھ جوڑ چکا ہوتا ہے۔

یہ وہ نفسیاتی سیاست ہے جسے ماہرین لسانیات Framing Theory کے تحت بیان کرتے ہیں کہ جب کسی حقیقت کو مخصوص زاویہ سے فریم کر کے پیش کیا جائے، تو وہ حقیقت اپنی معنوی آزادی کھو دیتی ہے، اور جواب دہندہ کا ذہن پہلے سے ایک تیقن کے سانچے میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ معروف تجزیہ نگار Arjun Appadurai اس کو "Fear of Small Numbers" کہہ کر بیان کرتے ہیں:

"Minorities pose an existential challenge to majority identity not by size but by difference[6]".

"اقلیتیں اکثریت کی شناخت کو وجودی چیلنج اُن کی تعداد سے نہیں بلکہ اُن کے اختلاف سے دیتی ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد چاہے کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، ان کی تہذیبی خودی، ان کا لباس، ان کی زبان، اور ان کے شعائر اکثریتی معاشروں کے لیے ثقافتی عدمِ تحفظ (cultural insecurity) کا باعث بن جاتے ہیں—اور یہی احساس پھر عوامی رائے میں اسلاموفوبیا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی رائے پھر میڈیا اور سیاسی پالیسیوں کو متاثر کرتی ہے، اور یوں ہم ایک دائرہ مکمل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں:

1. میڈیا اسلام کو خطرہ کے طور پر دکھاتا ہے،
2. عوامی رائے اس خطرے کو قبول کرتی ہے،
3. سروے اس خطرے کو "تسلیم شدہ رائے" میں تبدیل کرتے ہیں،
4. ریاستیں اسی رائے کی بنیاد پر پالیسیاں بناتی ہیں۔
5. اور پھر وہ پالیسیاں مزید عوامی ذہن کو جکڑ لیتی ہیں۔

یٰسین ثاقب اپنی تحقیق سروے اور سچائی: جدید رائے عامہ کی فکری سیاست میں لکھتے ہیں:

"رائے عامہ کے سروے جب مخصوص ذہنی ڈھانچوں کو دہراتے ہیں تو وہ رائے نہیں رہتے، بلکہ علمی جواز پیدا کرنے والے دستاویز بن جاتے ہیں، جو تعصب کو مہذب زبان میں تحفظ دیتے ہیں۔"[7]

مذکورہ تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلاموفوبیا کا علمی مقابلہ محض فکری بیانات سے نہیں، بلکہ بیانیے کی تعمیرِ نو، سوالات کے نئے زاویے، اور سماجی شعور کی تطہیر سے ممکن ہے۔ جب تک سوالات کی بنیاد میں تعصب رہے گا، جوابات کے تجزیے میں انصاف ممکن نہیں ہو سکے گا۔

## مزاح، طنز اور تخلیقی اظہار میں اسلاموفوبیا: ذہنی تفریح یا فکری تحقیر؟

اسلاموفوبیا کی سب سے پُرخطر اور دیرپا شکل وہ ہوتی ہے جو تفریح اور مزاح کے قالب میں ڈھل کر پیش کی جاتی ہے۔ جب کسی تہذیب، مذہب، یا گروہ کو عوامی ہنسی کا موضوع بنا دیا جائے، تو وہ نہ صرف سماجی طور پر غیر سنجیدہ سمجھا جانے لگتا ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف جذبات کو "معمول" کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ برتی جا رہی ہے اور یہ عمل خاص طور پر مزاحیہ شوز، کارٹون، کامیڈی سیریز، سوشل میڈیا میمز اور فلمی اسکرپٹس کے ذریعے اجتماعی شعور میں رچ بس چکا ہے۔

Charlie Hebdo جیسے فرانسیسی جریدے نے توہین رسالت کے خاکوں کو صرف "اظہارِ رائے کی آزادی" نہیں بلکہ ایک فکری طنز کی فتح کے طور پر پیش کیا۔ یہ طنز، جو نبی کریم ﷺ کی شان میں صریح گستاخی تھی، یورپ میں ہزاروں افراد کی عوامی حمایت، سیاسی تحفظ، اور میڈیا کی تائید حاصل کر سکی، کیونکہ وہ "آرٹ"، "آزادی"، اور "جمہوریت" کے نعروں میں ملفوف تھی۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کارٹون بنائے گئے اصل المیہ یہ تھا کہ ان کارٹونز کو ہنسی، آزادی اور دانشوری کے استعارے کے طور پر قبول کیا گیا۔ امریکہ میں Saturday Night Live، Family Guy، South Park جیسے پروگراموں میں مسلمانوں کو ایک مخصوص لسانی، جسمانی، اور فکری خاکے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے: داڑھی والا مرد، نقاب پوش عورت، غصے میں بولنے والا، عربی زبان میں کچھ بڑبڑانے والا، جو یا تو بم لے کر گھوم رہا ہے یا کسی سازش میں ملوث ہے۔ یہ کردار سامعین کے لیے تفریح کا باعث ہوتے ہیں، لیکن ناظرین کی لاشعوری نفسیات میں اسلام کا ایک مستقل، منفی خاکہ پیدا کرتے ہیں۔

Edward Said نے اسی قسم کے ثقافتی تاثر کو "normalization of otherness" کا نام دیا:

"The process of turning difference into distance, and distance into ridicule, is central to maintaining power in cultural representation[8]".

"فرق کو فاصلہ، اور فاصلے کو تمسخر میں بدلنے کا عمل ثقافتی نمائندگی میں طاقت کے تحفظ کا بنیادی ذریعہ ہے۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمان ثقافتی بیان میں ہنسی کا موضوع بن جائیں، تو اصل میں ان کی شناخت کو طاقت کے توازن سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ وہ اب سنجیدہ مکالمے، فکری احترام، یا تہذیبی مساوات کے لائق نہیں سمجھے جاتے، کیونکہ وہ ایک "مزاحیہ تصور" میں ڈھال دیے گئے ہیں۔ یہ مزاح محض الفاظ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ بصری علامات، فلمی کلپ، گانوں کے بول، اور سوشل میڈیا ریلس تک پھیل چکا ہے۔ TikTok اور Instagram پر مسلمانوں کے حلیے، عربی زبان، یا مذہبی کلمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے جنہیں لاکھوں بار دیکھا، پسند، اور شیئر کیا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا نے اس "تفریحی تعصب" کو عوامی سطح پر مسکراہٹ کے ساتھ نفرت کی ترسیل (smiling transmission of hate) بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر احسن طاہر اپنی کتاب "تفریح میں تحقیر: ایک فکری مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"جب کسی تہذیب کو مسلسل مزاح کی علامت بنا دیا جائے تو اس کے خلاف کوئی بھی سنجیدہ استدلال سماعت سے پہلے ہی مردود ہو جاتا ہے۔ یہی اسلاموفوبیا کی وہ شکل ہے جو دلیل کی نہیں، تضحیک کی زبان بولتی ہے۔"[9]

یہ قول اسلاموفوبیا کے اس پہلو کی وضاحت کرتا ہے جو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ اثر رکھتا ہے: وہ ذہنی تاثر جو سنجیدہ نفرت کو بھی مزاح میں بدل دیتا ہے۔ اور یہی سب سے بڑی خطرناک تبدیلی ہے کہ عوامی ذہن اب اسلام کو سمجھنے نہیں، اس پر ہنسنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔

## اسلامی اصطلاحات کی عوامی معنوی تحریف: "جہاد"، "شریعت" اور "خلافت"

جب کسی مذہب کی اصل فکری اصطلاحات کو عوامی فہم میں غلط، مسخ شدہ، یا خوفناک معنوں میں متعارف کرا دیا جائے، تو وہ مذہب اپنے دفاع سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسلاموفوبیا کی سب سے گہری اور دیرپا کارگزاری یہی ہے کہ اس نے اسلامی اصطلاحات کو عوامی ذہن میں تحریف، خوف اور دشمنی کی علامت بنا دیا ہے۔ ان اصطلاحات کو محض لغوی یا علمی سطح پر نہیں بگاڑا گیا، بلکہ انہیں ایک ایسے تہذیبی سانچے میں پیش کیا گیا ہے جہاں وہ ہر سننے والے کے ذہن میں ایک معینہ منفی تصویر پیدا کرتے ہیں۔

"جہاد"—جو اسلامی تعلیمات میں خود سازی، ظلم کے خلاف مزاحمت، اور حق کے قیام کی ہمہ جہت جدوجہد کا نام ہے اسے مغربی عوامی شعور میں صرف دہشت گردی، خودکش حملہ، اور مذہبی انتہا پسندی کے طور پر پیش کیا گیا۔ عوامی سطح پر لفظ "Jihad" سنتے ہی ذہن میں بارود،

تشدد، اور "اسلامی خطرہ" کی تصویر ابھرتی ہے۔ یہ تصویر کسی ایک خبر یا واقعے کا نتیجہ نہیں بلکہ دو دہائیوں پر محیط فکری مہم کا حاصل ہے، جو میڈیا، فلم، خبروں اور نصاب کے ذریعے عام کی گئی۔

The Oxford Dictionary of Islam کے مطابق:

"In Western media, the term Jihad is almost exclusively associated with holy war, ignoring its broader spiritual and social dimensions in Islamic tradition[10]".

"مغربی میڈیا میں 'جہاد' کو تقریباً مکمل طور پر مقدس جنگ سے جوڑا گیا ہے، اور اس کی اسلامی روایت میں موجود روحانی و سماجی جہات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔"

یہ صرف "جہاد" ہی نہیں "شریعت" جیسی جامع اصطلاح بھی مغرب میں عوامی سطح پر ظلم، ہاتھ کاٹنے، عورتوں کی مظلومیت، اور غیر لچکدار قانون کے استعارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ تاثر اس قدر عام ہو چکا ہے کہ بعض امریکی ریاستوں میں " Anti-Shariah Legislation" پیش کی گئی، حالانکہ وہاں شریعت نافذ ہی نہیں تھی۔ یہ ہنگامی رد عمل ایک حقیقی اسلامی نظام کے خوف سے نہیں، بلکہ اس تخیلاتی شریعت کے خلاف تھا جسے عوامی شعور میں مخصوص رنگ دے کر پیش کیا گیا۔

اسی طرح "خلافت" جو تاریخی طور پر مسلم دنیا کی علمی، اخلاقی، انتظامی اور تہذیبی مرکزیت کا نام ہے — اسے مغربی عوامی فہم میں صرف داعش، شدت پسندی اور مذہبی فسطائیت سے جوڑ دیا گیا۔ اب جب کسی مغربی شہری کے سامنے "Caliphate" کا لفظ آئے تو وہ اسے علمی ادارے یا فکری میراث کے بجائے ایک شدت پسند گروہ کی نمائندگی سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ صرف فکری غلطی نہیں، بلکہ لسانی نفسیات کی منصوبہ بندی ہے۔ عوامی ذہن سازی کے ماہرین جانتے ہیں کہ جب کوئی اصطلاح اپنے اصل معانی سے کٹ جائے، تو اس کے ساتھ فکری دشمنی خود کار ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر فیاض احمد خان اس عمل کو "مفہوم کشی" (semantic neutralization) کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب کسی مذہب کی کلیدی اصطلاحات کو تخریب کا استعارہ بنا دیا جائے تو وہ مذہب اپنی فکری طاقت کھو دیتا ہے۔ اصطلاحات، تصور سے پہلے قتل کر دی جاتی ہیں۔"[11]

یہی عمل عوامی رائے عامہ میں اسلاموفوبیا کو مستحکم کرتا ہے — کیونکہ لوگ اب اسلام کو "سن کر" نہیں، "سمجھ کر" نہیں، بلکہ صرف "محسوس کر کے" رد کرتے ہیں۔ وہ کسی دلیل یا تنقید کے تحت اسلام کو مسترد نہیں کرتے بلکہ صرف اس کے الفاظ کو سنتے ہی ایک خطرے کی گھنٹی بجتی ہے — اور یہی وہ کیفیت ہے جو کسی بھی نظریے کی عوامی شکست کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔

## عوامی خاموشی اور شعوری بے حسی: اسلاموفوبیا کی غیر مرئی معاونت

اسلاموفوبیا کے مظاہر کو صرف وہ لوگ نہیں بڑھاتے جو کھلے عام اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز زبان استعمال کرتے ہیں یا پالیسی سازی میں سرگرم کردار ادا کرتے ہیں۔ بلکہ اس مظہر کو سب سے زیادہ توانائی ان عوامی طبقات سے ملتی ہے جو نہ تو مخالفت کرتے ہیں، نہ حمایت، بلکہ خاموشی، لاتعلقی اور بے عملی کی پالیسی اپناتے ہیں۔ یہ وہ مجمع ہے جو ہر ظلم، تعصب اور استحصال کے خلاف یا تو "غیر مطمئن" تو ہوتا ہے مگر "رد عمل" نہیں دیتا اور یہی غیر رد عمل سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

عوامی نفسیات میں خاموشی کو اکثر "غیر جانبداری" سمجھا جاتا ہے، لیکن جب کوئی معاشرہ کسی مذہب، قوم یا عقیدے کے خلاف مسلسل منفی بیانیے، امتیازی سلوک، اور ثقافتی تحقیر کا مشاہدہ کرے اور پھر بھی وہ خاموش رہے تو یہ خاموشی، عملاً غیر اعلانیہ رضامندی میں تبدیل ہو جاتی

ہے۔اس رضامندی کی سب سے خطرناک شکل وہ ہوتی ہے جس میں ظالم کو قوت اور مظلوم کو تنہائی ملتی ہے۔اس مظہر کو ماہر سماجیات Stanley Cohen نے اپنی کتاب States of Denial میں "Passive Complicity" کا نام دیا:

"The silent witness is the most fertile ground for legitimizing cruelty; they offer no resistance, thus granting invisible permission to the aggressor[12]".

"خاموش گواہ ظالمانہ رویے کو جائز بنانے کی سب سے زرخیز زمین ہوتے ہیں؛ وہ کوئی مزاحمت نہیں کرتے، اس لیے ظالم کو غیر محسوس اجازت فراہم کرتے ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلاموفوبیا کی پرورش میں عوامی خاموشی محض اخلاقی کمزوری نہیں بلکہ فکری معاونت ہے۔ جب مغربی معاشرے کے معتدل افراد اسلاموفوبیا پر "افسوس" تو کرتے ہیں، لیکن اس کے خلاف نہ بولتے ہیں، نہ کھڑے ہوتے ہیں، تو وہ اس بیانیے کو اجتماعی تسلیم (collective normalization) میں بدل دیتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں 2022 میں ہونے والے YouGov سروے میں جب عوام سے پوچھا گیا کہ "اگر کسی سیاسی رہنما نے مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز الفاظ استعمال کیے، تو کیا آپ اُسے ووٹ دیں گے؟" تو 39٪ افراد نے کہا: "اگر وہ معیشت یا سلامتی کے معاملات میں مؤثر ہو تو ضرور"۔

یہ ردعمل ظاہر کرتا ہے کہ عوامی ترجیحات میں اسلاموفوبیا اخلاقی برائی کے بجائے ایک قابلِ نظر انداز فیکٹر بن چکا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب نفرت، تعصب اور امتیاز کو سیاسی، تہذیبی اور فکری تحفظ مل جاتا ہے نہ اس لیے کہ سب لوگ متعصب ہیں، بلکہ اس لیے کہ متعصبوں کے خلاف آوازیں خاموش ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر افتخار علوی اپنی کتاب سکوت کا گناہ: مسلم مظلومیت اور مغرب کا ضمیر میں لکھتے ہیں:

"جب ظالم کے مقابلے میں سماج خاموش ہو جائے تو یہ صرف اخلاقی بحران نہیں، بلکہ تہذیبی افلاس ہوتا ہے۔ اسلاموفوبیا کی اصل طاقت وہ لوگ نہیں جو بولتے ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہیں بولتے۔"[13]

یہی وہ نکتہ ہے جو اسلاموفوبیا کے عوامی پھیلاؤ کو سب سے پیچیدہ بناتا ہے کہ وہ خاموشی سے بڑھتا ہے، اور اپنی طاقت خاموش ضمیروں سے حاصل کرتا ہے۔ اسلام کے خلاف نفرت انگیز بیانیہ جب گلی، محلے، سوشل میڈیا، اسکول، اور دفتر میں عام ہو جائے — اور لوگ اسے صرف "رائے" سمجھ کر گزر جائیں تو نفرت محض جذبات نہیں رہتی بلکہ وہ معاشرتی ساخت میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تعصب کا مقابلہ فقط دلیل سے نہیں، بلکہ عزم، آواز، اور کھلی مخالفت سے کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

## عوامی بیانیے کے خلاف ضمیر کی روشنی: اسلاموفوبیا پر غیر مسلم دانشوروں کی مزاحمت

اسلاموفوبیا کی عوامی گہرائی، قانونی توثیق، اور ثقافتی مقبولیت کے باوجود مغرب میں کچھ ایسی روشن فکری آوازیں موجود ہیں جو اس طوفان کے سامنے چراغ کی مانند کھڑی ہوئیں۔ ان آوازوں کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ کسی اسلامی تحریک یا مشن کا حصہ نہیں تھیں، بلکہ وہ انصاف، انسانی برابری، اور فکری دیانت کے عمومی اخلاقی اصولوں کے تحت متحرک ہوئیں۔ ان میں سے بعض نے اپنے شعبے، اپنی قوم، حتیٰ کہ اپنی شہرت کو خطرے میں ڈال کر اسلام اور مسلمانوں کے لیے حق گوئی کا راستہ اختیار کیا۔ سب سے نمایاں مثال Robert Fisk کی ہے، معروف برطانوی صحافی، جو The Independent اخبار میں مشرق وسطیٰ سے متعلق دو دہائیوں سے زائد عرصہ رپورٹنگ کرتے رہے۔ وہ ان معدودے چند مغربی صحافیوں میں سے تھے جنہوں نے نائن الیون کے بعد مسلمانوں کے خلاف مغربی میڈیا کے بیانیے کو کھلے عام جھٹلایا۔ انہوں نے 2003 میں اپنی ایک رپورٹ میں لکھا:

" <To call Muslims 'Islamists' whenever it suits our narrative is a perversion of journalistic ethics; we cannot wage war against people's faith and then demand their assimilation[14]".

"جب بھی ہمارے بیانیے کو ضرورت ہو، مسلمانوں کو 'اسلامسٹ' کہنا صحافتی اخلاقیات کا انحراف ہے؛ ہم لوگوں کے دین پر جنگ مسلط کریں اور پھر انضمام کا مطالبہ بھی کریں؟"

یہ بیان صرف الفاظ نہیں، بلکہ ایک فکری بغاوت تھی — جس میں Fisk نے مغربی میڈیا کے پورے سانچے کو چیلنج کیا۔ یہی وہ ہمت ہے جو مغرب کے اجتماعی ضمیر میں ایک صاف شفاف رگ کی موجودگی کا ثبوت ہے۔اسی طرح امریکی سوشیالوجسٹ Mark Juergensmeyer نے اپنی کتاب Terror in the Mind of God میں جہاد، اسلامی سیاست، اور مسلم ردعمل کے حوالے سے ایسی دیانت دارانہ تحقیق پیش کی جس میں اسلام کو انتہا پسندی کے برابر نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے سیاسی تناظر سے آزاد کر کے مذہبی شعور کی روشنی میں پرکھا گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"What we call Islamic terrorism is more about our own misunderstanding of Muslim political grievances than about their faith[15]".

" جسے ہم اسلامی دہشت گردی کہتے ہیں وہ زیادہ تر ہمارے اپنے مسلم سیاسی شکووں کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، نہ کہ ان کے عقیدے کا۔"

یہ بات مغربی رائے عامہ کے خلاف جا کر کہی گئی تھی اور یہی وہ فکری روشنی ہے جو ایک اندھیری فضا میں تحقیقی ضمیر کو زندہ رکھتی ہے۔

یونانی نژاد امریکی فلسفی Cornel West، جنہیں افریقن امریکن فکری تحریک میں گہری قبولیت حاصل ہے، نے بھی 2015 میں یہ بات کہی:

"To be truly democratic in spirit, the West must listen to Muslim voices not as threats, but as moral interlocutors in global dialogue[16]".

"اگر مغرب واقعی روحانی طور پر جمہوری بننا چاہتا ہے، تو اُسے مسلمانوں کی آواز کو خطرہ نہیں بلکہ عالمی مکالمے میں اخلاقی مخاطب سمجھنا ہو گا۔"

اس جملے کی گہرائی یہ ہے کہ یہ نہ صرف اسلاموفوبیا کو رد کرتا ہے، بلکہ مسلمانوں کو عالمی اخلاقی مکالمے میں فکری شرکاء کے طور پر دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی وہ تبدیلی ہے جسے عوامی سطح پر اختیار کیا جائے تو پوری رائے عامہ کی ساخت بدل سکتی ہے۔اس سے متعلق ڈاکٹر نورالحسن زیدی اپنی کتاب ضمیر کی زبان: مغرب کے فکری باغی میں لکھتے ہیں:

"مغربی دنیا میں وہ افراد جو اسلاموفوبیا کے خلاف بولتے ہیں، وہ صرف اسلام کی حمایت نہیں کرتے بلکہ مغرب کی فکری نجات کا راستہ بھی کھولتے ہیں۔ یہ ضمیر کے وہ مینار ہیں جو تعصب کے سمندر میں روشنی کی حدیں متعین کرتے ہیں۔"[17]

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں عوامی رائے عامہ مکمل طور پر متعصب نہیں بلکہ اس میں وہ ضمیر کے گوشے موجود ہیں جو سچ کی طرف مائل ہیں، بشرطیکہ انہیں علم، حقائق، اور اخلاقی جرأت کے ساتھ مخاطب کیا جائے۔ اسلاموفوبیا کے خلاف فکری مزاحمت کا یہ پہلو ہمیں بتاتا ہے کہ تبدیلی ممکن ہے — اور وہ تبدیلی باہر سے نہیں، بلکہ ضمیر کی اندرونی بیداری سے آتی ہے۔

## نئے ذرائع ابلاغ میں اسلامی شناخت کی تخریب:

اسلاموفوبیا کی عوامی تشکیل میں جو عنصر سب سے جدید، سب سے وسیع، اور سب سے تیز اثر رکھتا ہے وہ ہے ڈیجیٹل میڈیا — یعنی سوشل پلیٹ فارمز، بلاگز، وی لاگز، یوٹیوب چینلز، میمز، اور مختصر ویڈیوز کا وہ عالمی نیٹ ورک جس نے اب انسان کے شعور اور لاشعور دونوں میں فوری تاثر کی قوت پیدا کر دی ہے۔ ان ذرائع نے صرف معلومات کی ترسیل کو نہیں بدلا، بلکہ معنوں، تصویروں، اور فکری رجحانات کی ساخت کو ہی نئے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلاموفوبیا کی سب سے جدید ترین اور نازک ترین ساخت ڈیجیٹل فوبیا ہے—جو نظر نہیں آتی، لیکن ہر اسکرین، فیڈ، ٹرینڈ اور تھریڈ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اگر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے اسلام کو "غیر" کے طور پر دکھایا، تو سوشل میڈیا نے اسے "خطرہ" کے طور پر اندرونی طور پر محسوس کروایا۔ مثلاً TikTok، Instagram، Reddit اور Twitter/X پر اسلام اور مسلمانوں سے متعلق لاکھوں پوسٹس روزانہ شیئر ہوتی ہیں، جن میں سے بڑی تعداد طنز، مذاق، جعلی بیانات، یا خوفناک تصویری اقتباسات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں اکثر ایسی ویڈیوز شامل ہوتی ہیں جن میں حجاب، اذان، عربی زبان، یا اسلامی جملوں کو "خوف، اجنبیت، اور انتہا پسندی" کے پس منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ تمام مواد بظاہر "رائے"، "مزاح"، یا "تبصرہ" ہوتا ہے، مگر دراصل وہ ڈیجیٹل فضا میں ایک فکری ماحول تخلیق کرتا ہے جو نوجوان نسل کے لیے کسی کتاب، تقریر یا دلیل سے کہیں زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ جب کوئی نوجوان بارہا کسی مخصوص مذہب سے متعلق منفی، جذباتی، یا ڈراؤنی تصاویر دیکھتا ہے، تو اس کا ذہن بغیر کسی منطقی دلیل کے اس مذہب سے خوفزدہ یا متنفر ہو جاتا ہے۔

ماہرِ ابلاغیات Manuel Castells نے اپنی تحقیق میں لکھا:

"Digital media no longer merely communicate; they structure the mindscapes of the user by repetition, emotional frames, and visual symbols[18]".

"ڈیجیٹل میڈیا اب صرف ترسیل کا ذریعہ نہیں رہا، بلکہ یہ تکرار، جذباتی فریمز، اور بصری علامات کے ذریعے صارف کے ذہنی مناظر کو تشکیل دیتا ہے۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلاموفوبیا کے پھیلاؤ میں ڈیجیٹل ذرائع نے رائے عامہ کے ذہن ساز کارخانے کا کردار اختیار کر لیا ہے۔ اب تعصب صرف بولے یا لکھے ہوئے الفاظ میں نہیں، بلکہ چند سیکنڈز کی ویڈیو، ایک سطر کی پوسٹ، یا ایک خاکے کے ذریعے داخل ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں راشد اپنی کتاب ڈیجیٹل خوف: اسلاموفوبیا کی نئی زبان میں لکھتے ہیں:

"سوشل میڈیا کا اسلاموفوبیا خالص تعصب نہیں، بلکہ یہ تعصب کی 'جذباتی مارکیٹنگ' ہے۔ صارف کو دلیل نہیں دی جاتی، بلکہ جذباتی تصویر دی جاتی ہے اور وہ اسی تصویر سے فیصلہ کر لیتا ہے۔"[19]

یہی وہ کیفیت ہے جو عوامی رائے کو علم، انصاف، اور توازن سے کاٹ کر صرف ردعمل، جذبات، اور فوری تاثر کی بنیاد پر اسلام سے دور کرتی ہے۔ اسلام اب ان کے لیے صرف ایک مذہب نہیں رہا، بلکہ ایک ڈیجیٹل خوف کی علامت بنتا جا رہا ہے۔

اس ڈیجیٹل فضا میں مسلمان نوجوان بھی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت کے اظہار میں ہچکچاتے ہیں، اپنے نظریات چھپاتے ہیں، اور ڈیجیٹل حلقوں میں اپنی مذہبی وابستگی سے کتراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی پوسٹ، کومنٹ یا تصویر پر ردعمل کا سیلاب آ سکتا ہے۔ یہ نفسیاتی دباؤ صرف شخصی نہیں، بلکہ اجتماعی اسلامی خودی کی تنزلی کا پیش خیمہ ہے۔

## نتائج بحث

اس تحقیقی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلاموفوبیا ایک سطحی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک گہری اور پیچیدہ تحریک ہے جو عوامی شعور کو نفسیاتی طور پر متاثر کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ تحقیق کے دوران یہ معلوم ہوا کہ یہ تحریک درج ذیل طریقوں سے نفوذ پذیر ہو رہی ہے۔

**نفسیاتی تعمیر:** اسلاموفوبیا کی ذہن سازی کا بنیادی مقصد خوف اور اضطراب پیدا کرنا ہے۔ اس کے لیے مخصوص تصاویر، علامات اور بیانیے کو بار بار دہرایا جاتا ہے، جس سے عوام میں ایک مخصوص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ سمجھتا ہے۔

**لسانی تحریف:** "جہاد" اور "شریعت" جیسی اسلامی اصطلاحات کو ان کے اصل معنی سے ہٹ کر دہشت گردی اور قدامت پرستی کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لسانی تحریف نے عام لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کی مثبت تصویر کو بری طرح مسخ کیا ہے۔

**میڈیا کا کردار:** روایتی اور نئے ذرائع ابلاغ نے اسلاموفوبیا کی نشر واشاعت میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر غلط معلومات اور نفرت انگیز بیانیے کا پھیلاؤ اس تحریک کو تیزی سے وسعت دینے کا ذریعہ بنا ہے۔

**عوامی خاموشی:** مسلم اور غیر مسلم دونوں معاشروں میں ایک بڑی تعداد کی خاموشی اور عدم دلچسپی نے اس تحریک کو مزید فروغ دیا ہے۔ یہ خاموشی ایک طرح سے اس بیانیے کی قبولیت کا اشارہ دیتی ہے۔

**غیر مسلم دانشوروں کی مزاحمت:** اس منفی ماحول کے باوجود، بعض غیر مسلم دانشوروں نے اسلاموفوبیا کے خلاف علمی اور فکری مزاحمت کی ہے۔ ان کی کوششیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ضمیر کی آواز کسی مخصوص مذہب سے بالاتر ہوتی ہے، اور یہ مزاحمت اسلاموفوبیا کے بیانیے کی غیر منطقی بنیادوں کو بے نقاب کرتی ہے۔

## سفارشات

اس تحقیق کی بنیاد پر درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

اسلام کی درست تعلیم: مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی اور پر امن تعلیمات کو منظم اور مؤثر انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر "جہاد" اور "خلافت" جیسی اصطلاحات کے درست معانی اور تاریخی سیاق وسباق کو واضح کیا جائے۔

**علمی مکالمہ:** مختلف مذاہب کے درمیان علمی اور فکری مکالمے کو فروغ دیا جائے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں اور باہمی احترام کو فروغ ملے۔

میڈیا کی حکمت عملی: نئے ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا کو اسلاموفوبیا کا مقابلہ کرنے کے لیے بطور ایک مثبت اور تعمیری پلیٹ فارم استعمال کیا جائے۔ اس میں حقائق پر مبنی مواد اور مثبت بیانیے کی ترویج شامل ہے۔

**باہمی تعاون:** مسلمان اور غیر مسلم دانشوروں، صحافیوں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کو ایک مشترکہ محاذ قائم کرنا چاہیے تاکہ نفرت انگیز بیانیے کی مذمت کی جاسکے اور انسانی اقدار کو فروغ دیا جائے۔

**قوانین کی پاسداری:** حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کو نفرت انگیز تقاریر اور اسلاموفوبیا کو فروغ دینے والے اقدامات کے خلاف سخت قوانین بنانے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام سفارشات ایک ایسی جامع حکمت عملی کا حصہ ہیں جو نہ صرف اسلاموفوبیا کی روک تھام کرے گی بلکہ دنیا میں امن اور باہمی احترام کی فضا قائم کرنے میں بھی مدد دے گی۔

---

## حوالہ جات


[1] Jack Shaheen, Reel Bad Arabs: How Hollywood Vilifies a People, Interlink Publishing, 2012

[2] Media Diversity Institute Europe, Islam in the European Press, Brussels, 2022

[3] Stuart Hall, Encoding and Decoding in the Television Discourse, Centre for Contemporary Cultural Studies, University of Birmingham, 1973

[4] حسن فراز، اسلام کا مغربی شعور میں استعاراتی زوال، لاہور: ادارہ علم وحکمت، 2018، ص119

[5] Pew Research Center, Attitudes Toward Muslims in Western Europe, Washington, DC: 2021

[6] Arjun Appadurai, Fear of Small Numbers, Durham: Duke University Press, 2006, p. 7

[7] یٰسین ثاقب، سروے اور سچائی، کراچی: ادارہ ابلاغ وافکار، 2020، ص94

[8] Edward W. Said, Culture and Imperialism, New York: Vintage Books, 1993, p. 212

[9] احسن طاہر، تفریح میں تحقیر، لاہور: فکریات پبلشرز، 2021، ص93

[10] John L. Esposito, Oxford Dictionary of Islam, Oxford University Press, 2003, p. 152

[11] فیاض احمد خان، فکر کی لغت میں تحریف کا عمل، اسلام آباد: نظریہ اکیڈمی، 2019، ص121

[12] Stanley Cohen, States of Denial: Knowing About Atrocities and Suffering, Cambridge: Polity Press, 2001, p. 87

[13] افتخار علوی، سکوت کا گناہ، اسلام آباد: مرکز تعبیر، 2021، ص138

[14] Robert Fisk, The Independent, March 2003

[15] Mark Juergensmeyer, Terror in the Mind of God, University of California Press, 2001, p. 173

[16] Cornel West, Democracy Matters, Penguin Books, 2015, p. 92

[17] نورالحسن زیدی، ضمیر کی زبان، لاہور: دانش پبلشرز، 2022، ص166

[18] Manuel Castells, Communication Power, Oxford University Press, 2009, p. 95

[19] ہمایوں راشد، ڈیجیٹل خوف، کراچی: المیزان پبلشرز، 2022، ص102